© rasailojaraid.com

علمائے ہند کا سیاسی موقف

مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی ایم۔اے

صدر شعبۂ عربی و فارسی دارد دہلی یونیورسٹی و مدیر برہان

آج کل دنیا میں صرف ہندوستان ہی ایسا ملک ہے جہاں سیاست کا دامن مذہب کے ساتھ بندھا ہوا ہے یہاں کے عوام ہندو ہوں یا مسلمان ان میں مذہب کی تعلیمات کا اثر پایا جائے یا نہیں اور ظاہر یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی یہ اثر نہیں پایا جاتا۔ تاہم مذہب کا ان کے دل و دماغ پر اتنا اثر ہے کہ وہ اس کے نام پر کسی طبقہ کے سیاسی اغراض کا آلۂ کار آسانی سے بن سکتے ہیں، گذشتہ دس پندرہ سال میں مسلمانوں کی سیاست کا سب سے بڑا زور مذہب اور قومی حقوق کی حفاظت پر رہا اور اسی بنیاد پر انھوں نے اپنے لئے ایک الگ ریاست کا مطالبہ کیا لیکن مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ جو قوم پرور کہلاتا ہے اور جو اپنے فکر و عمل کے اعتبار سے پکا اور سچا مسلمان بھی ہے وہ نہ صرف یہ کہ لیگ کی سیاست سے الگ رہا بلکہ علی الاعلان اور شد و مد کے ساتھ اس کا مخالف رہا اس طبقہ کو علماء کی حمایت اور قیادت حاصل تھی۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ لیگ کے برسر اقتدار آنے کے بعد ہندوستان کے مسلمان دو پارٹیوں میں بٹ گئے تھے ایک پارٹی مذہبی لوگوں کی تھی جو علماء کی قیادت میں لیگ کے سخت مخالف تھے اور دوسرا گروہ ان مسلمانوں کا تھا جو باعتبار اکثریت دیندار اور مذہبی لوگ نہیں کہے جا سکتے۔ اور اس گروہ کو قیادت بھی ان حضرات کی ہی حاصل تھی جو مغربی تہذیب و تمدن میں ڈوبے ہوئے تھے اور جن کی زندگیاں بے شبہ غیر اسلامی تھیں۔ لیکن بایں ہمہ عجیب بات یہ ہے کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ مذہب کا درد اور اسلام اور مسلمانوں کی فکر کا سب سے زیادہ دعویٰ موخرالذکر گروہ ہی کو تھا وہ پہلے گروہ کی سیاست پر سخت نکتہ چینی کرکے یہاں تک کہتا تھا کہ علمار ملت فروش ہیں۔ قوم کے غدار ہیں ہندوؤں کے ہاتھ بک گئے ہیں اسلام کو انھوں نے چند ٹکوں کے عوض میں بیچ دیا ہے۔ لیکن پہلے گروہ پر ان باتوں کا اثر بالکل نہیں ہوا وہ دنیا بھر کے ظلم وستم اور ہر قسم کی بداخلاقی وایذا رسانی کا صبر و استقلال سے مقابلہ کرتا رہا اور اپنے سیاسی موقف سے ذرا جنبش نہیں کی۔

لیگ اور علمار کی آویزش دراصل دو نقطۂ خیال (Ideology) کی کشمکش تھی جس کو ہم دیوبند اور علیگڈھ کی آویزش کہہ سکتے ہیں۔ یہ کشمکش آج کی نہیں بلکہ بہت پرانی تھی اور سرسید کے زمانے سے ہی چلی آرہی تھی۔ جس کی تفصیل آگے چل کر اپنے مقام پر آئیگی! تحریک خلافت کے زمانہ میں سرسید گروپ کو علمار کے مقابلہ میں شکستِ فاش ہوئی۔ یہ تحریک علمار کی رہنمائی میں اس شان سے چلی کہ مذہبی اقتدار کے علاوہ ملک میں ان کا سیاسی وقار بھی قائم ہوگیا اس تحریک کے سب سے بڑے لیڈر مولانا محمد علی۔ شوکت علی تھے اور ان دونوں بھائیوں کا یہ عالم تھا کہ علمار کی رہنمائی کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ اور بعض علمار کے ساتھ تو ان کا تعلق پیر و مرید کا سا تھا۔ تحریک خلافت چونکہ علمار کے زیر قیادت پیدا ہوئی اور بڑھی اور پھولی پھلی تھی اس بنا پر اس تحریک میں ایک عام مذہبیت اور دینداری کا رنگ تھا اور یہی وجہ تھی کہ اس تحریک میں شریک ہوتے ہی مسٹر محمد علی اور مسٹر شوکت علی جو علیگڈھ کے نمایاں اور لائق صد فخر فرزند تھے یک بیک مولانا محمد علی شوکت علی بن گئے ان پر دینداری کا ایسا گہرا رنگ چڑھا کہ اعماق قلب وجگر میں پیوست ہوگیا اور آخر اسی پر انھوں نے جان جان آفریں کے سپرد کردی ان دونوں بھائیوں کے علاوہ اور بھی بہتیرے فرزندان علیگڈھ تھے جو علیگڈھ اور اس کے مکتب خیال (School of thought) سے باغی ہوکر مذہبی گروہ کے کیمپ میں آگئے۔ ان کی شکل وصورت اور وضع قطع سے بھی دینداری برسنے لگی بہرحال علمار کے زیر سایہ تحریکِ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خلافت کے چلنے کا یہ اثر ہوا کہ خود فرزندانِ علیگڈھ کی ایک جماعت میں علیگڈھ کے خلاف بغاوت کا جذبہ پیدا ہو گیا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سیاست کے میدان میں یہ قدیم تعلیم یافتہ گروہ کی عظیم الشان فتح اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی شکست فاش تھی۔

تحریکِ خلافت کے ختم ہونے اور خلافت کمیٹیوں کے معطل ہو جانے کے بعد مسلمانوں نے سیاسی کاموں کے لئے کانگرس میں شرکت کر لی لیکن ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے ماتحت صوبوں میں وزارتیں قایم ہوئیں تو اب ملک کی سیاسیات میں فرقہ وارانہ رنگ پیدا ہونا شروع ہوا۔ ایک طرف تو یہ دیکھ کر کہ کانگرس کے ہاتھوں میں ملک کے اقتدار کی عنان منتقل ہو رہی ہے بہت سے ایسے مہاسبھائی ہندو جو اب تک اس سے الگ رہے تھے اس میں شامل ہو گئے اور انھوں نے اپنی شرکت سے کانگرس کی رائے عامہ کو متاثر کرنا شروع کیا اور دوسری جانب بعض صوبائی حکومتوں نے جو کانگرس کی نگرانی میں قایم ہوئی تھیں مسلمانوں کے ساتھ کچھ ایسے معاملات کئے جن کے باعث مسلمانوں کو ان سے شکایت پیدا ہو گئی ان دونوں چیزوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان کانگرس کی طرف سے بددلی محسوس کرنے لگے۔ اب مسلمانوں کے فرقہ پرست لیڈروں کو موقع مل گیا انھوں نے بڑے زور شور سے اپنی فرقہ پرستانہ سیاست کا پروپیگنڈہ کیا۔ اور عام مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اگر ہندوستان آزاد ہو گیا تو جمہوریت کے اصول کے مطابق سیاسی طاقت ہندوؤں کے ہاتھ آئے گی اور وہ مسلمانوں کے ساتھ جو بھاری اقلیت میں ہیں تعصب و عناد رکھنے کی وجہ سے ظلم و زیادتی کا معاملہ کریں گے۔ اس تخیل کو بنیاد قرار دے کر ان لوگوں نے مسلمانوں کے لئے ایک الگ ریاست کا مطالبہ کیا اور بڑے جوش و خروش سے کہا گیا کہ اگر مسلمانوں کی الگ ریاست قایم نہیں ہوئی تو اسلام کو سخت خطرہ ہے وہ فنا ہو جائیگا۔ ایک طرف مسلمان حکومت اسلامی سلطنت اور قرآنی بادشاہت کا دلآویز خواب اور دوسری جانب اس ریاست کے نہ بننے کی صورت میں ہندوستان سے اسلام اور مسلمانوں کے فنا ہو جانے کا شدید خطرہ! ہندوستان کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عام مسلمان جاہل، ناخواندہ اور ان پڑھ تو تھے ہی۔ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کے اس سیاسی حربہ کا شکار ہو گئے اور ووٹوں کی اکثریت کی روشنی میں آئینی حیثیت اس فرقہ پرستانہ سیاست کے علمبرداروں کی مسلّم ہو گئی۔ تحریک خلافت کے زمانہ میں اس طبقہ کو جو شکست ہوئی تھی اب ۳۵-۱۹۳۶ء میں مسلمانوں کی عظیم اکثریت کی حمایت حاصل کرنے کے بعد اس نے قدیم تعلیم یافتہ گروہ سے اپنا انتقام لینا شروع کیا، اس سلسلہ میں وہ سب کچھ کیا جو ایک غصہ سے بے قابو انسان اپنے مخالف کے ساتھ کر سکتا ہے ملک آزاد ہوا دو مملکتوں میں بٹ گیا۔ اور فرقہ پرست مسلمان جس ریاست کا مطالبہ کرتے تھے وہ ان کو مل بھی گئی اور اس پر جو فوری نتائج مرتب ہوئے وہ بھی اب سب کے سامنے ہیں اُن کی روشنی میں فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کی اس فرقہ پرورانہ سیاست نے ان کو بحیثیت مجموعی فائدہ پہنچایا یا نقصان۔ لیکن جہاں تک علمار کی جماعت کا تعلق ہے اُن کی نسبت یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اُن کا سیاسی موقف کیا ہے؟ اور ان کا سیاسی فکر اُن کے مذہبی تصورات کے ساتھ کیونکر ہم آہنگ ہے؟ موجودہ حالات میں یہ بات نہایت ضروری ہے کہ علمائے ہند کے سیاسی موقف کو خوب اچھی طرح سمجھ لیا جائے تاکہ ایک طرف برادرانِ وطن کسی اشتباہ میں نہ رہیں اور بعض اسلامی تعلیمات کی نسبت غلط فہمی کے باعث علمار کے سیاسی فکر و عمل اور ان کی کٹر مذہبیت میں جو عدم تطابق محسوس ہوتا ہے وہ رفع ہو جائے۔ اور دوسری جانب مسلمان اس فکر کو خوب اچھی طرح سمجھ کر اور اپنا کر اس کو عملی جامہ پہنائیں تاکہ وہ اپنے مستقبل کی تعمیر جمعیتِ خاطر اور دل و دماغ کی بیداری کے ساتھ کر سکیں!!! اس سلسلہ میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں ان کے جواب سے ہی علمائے ہند کا سیاسی موقف سمجھ میں آ سکے گا۔

۱۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے زوال کے بعد علمار نے مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کو واپس لانے کے لیے کچھ کیا یا نہیں! اگر کچھ کیا تو اس کا مقصد کیا تھا؟ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا دوبارہ قیام ان کا مقصد تھا یا ان کا نصب العین ایک عوامی اور جمہوری حکومت کا قائم کرنا تھا!

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۲۔ کیا پاکستان کے نام سے اسلامی حکومت یا مسلمانوں کی حکومت کے قیام کے بعد قرآنی حکومت قایم نہیں ہو سکتی تھی اگر ہو سکتی تھی تو علمار نے اس کی مخالفت کیوں کی ؟ کیا ان کو اسلام اور قرآن کی بادشاہت و حکومت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

۳۔ ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد اُس کے غیر منقسم ہونے کی شکل میں اس بات کا بڑا خطرہ تھا کہ یہاں جمہوری حکومت قایم ہوتی جیسا کہ اب ہے اور جس طرح آج کل کی عام جمہوریتوں میں ہوتا ہے۔ حکومت کے فیصلے عوام کی اکثریت کی خواہش اور اس کی رائے کے مطابق ہوتے اور یہ اکثریت چونکہ غیر مسلموں پر مشتمل ہوتی اس بنا پر یہ لوگ جمہوریت کا نام لینے کے باوجود اپنے ووٹوں کی کثرت سے مسلمانوں پر اپنی ڈکٹیٹر شپ قایم کر دیتے تو سوال یہ ہے کہ علمار کے ذہن میں پاکستان کی مخالفت کرتے وقت یہ خطرہ تھا یا نہیں ؟ اگر نہیں تھا تو کیا انھوں نے ہر ہندو کو جواہر لال سندر لال اور راجندر پرشاد سمجھ رکھا تھا اور کیا وہ ہندو مہا سبھا وغیرہ ایسی جماعتوں کی سرگرمیوں سے واقف نہیں تھے اور اگر خطرہ تھا تو اس سے محفوظ رہنے اور اسلام اور مسلمانوں کو اس کی زد سے بچانے کے لئے اُن کے ذہن میں کیا پروگرام تھا ؟

اب ہم ترتیب وار ہر ایک سوال کا جواب دیتے ہیں :۔

تحریک آزادی کا آغاز بعض لوگ کہتے ہیں کہ علمار کو سیاست نہیں آتی یا یہ کہ ان کا کام صرف درس وتدریس درقضا وافتا ہے سیاست ان کا میدان نہیں ہے۔ انھیں اس سے بے تعلق رہنا چاہیئے حالانکہ تاریخی اعتبار سے یہ بالکل غلط ہے شروع اسلام سے لیکر اس وقت تک مسلمانوں کی پوری تاریخ میں جب بھی کوئی چھوٹا بڑا انقلاب ہوا ہے وہ کسی نہ کسی عالم کی انفرادی یا طبقۂ علمار کی جماعتی کوششوں کی بدولت ہوا ہے سلاطین کا عزل ونصب، جنگ ومصالحت۔ امرار اور وزرار کا تقرر۔ یہ سب سیاسی کام ہیں اور علمار کے مشوروں سے انجام پاتے رہے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چنانچہ ہندوستان میں اورنگ زیب عالمگیرؒ کے بعد یہاں کی حکومت کو گھن لگنا شروع ہوا تو حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی نے نہ صرف یہ کہ اس کو محسوس کیا۔ بلکہ اس کے اسباب وعلل پر بڑی دیدہ وری اور جامعیت کے ساتھ بحث کی اور اُن کی اصلاح کس طرح ہو سکتی ہے اس کی طرف حکومت کو۔ امرار اور وزرار کو اور سوسائٹی کے دوسرے طبقات کو درجہ بدرجہ نہایت پرزور پر شکوہ الفاظ میں توجہ دلائی۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے بعد آپ کے صاحبزادہ اور صحیح جانشین حضرت شاہ عبدالعزیزؒ صاحب کی حیات ہی میں دہلی کے حالات اور زیادہ بگڑے اور "حکومت شاہ عالم از دہلی تا پالم" کی مثل صادق آنے لگی۔ انگریزوں کا اقتدار اور اُن کا ظلم وستم اور اس کے بالمقابل لال قلعہ کے بادشاہ کی قوت کا اضمحلال روز افزوں ہو گیا تو شاہ عبدالعزیز صاحب نے دہلی کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا۔ چنانچہ ایک شخص جس نے پوچھا تھا کہ "دارالاسلام دارالحرب بن سکتا ہے یا نہیں؟ حضرت شاہ صاحب اس کے جواب میں یہ بتانے کے بعد کہ کن چیزوں کے پیدا ہونے سے دارالاسلام دارالحرب بن جاتا ہے خاص دہلی کی نسبت ارشاد فرماتے ہیں۔

دریں شہر حکم امام المسلمین اصلاً جاری	امام المسلمین کا حکم اس شہر میں بالکل جاری نہیں
نیست و حکم رؤسا نصاری بے دغدغہ	ہے اور بڑے بڑے عیسائیوں کا حکم بے دغدغہ
جاری ست و مراد از اجرار احکام کفر	جاری ہے اور احکام کفر کے اجرار سے مقصد یہ
اینست کہ در مقدمہ ملک داری و بندوبست	کہ ملک داری رعایا کا بندوبست۔ خراج اور باج
رعایا و اخذ خراج و باج و عشور اموال تجارت	کا وصول کرنا۔ کسٹم ڈیوٹی لینا۔ رہزنوں کو سزا دینا
و سیاست قطاع الطریق و فیصل خصومات	اور مقدمات کا فیصلہ کرنا اور جرموں کی سزا دینا
و سزائے جنایات کفار بطور خود حاکم باشند[1]	یہ تمام معاملات یہ لوگ خود ہی کرتے ہیں۔

[1] فتاویٰ عزیزیہ جلد اول ص۱۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آگے چل کر فرماتے ہیں کہ اگرچہ بعض احکامِ اسلام ایسے ہیں جن سے یہ تعرض نہیں کرتے مثلاً جمعہ۔ عیدین اور اذان و ذبح بقر وغیرہ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے جب ان چیزوں کی جو اصل اور جڑ بنیاد ہے وہی ان کے نزدیک غیر وقیع ہے چنانچہ یہ لوگ بے تکلف مسجدوں کو گرا دیتے ہیں اور کوئی مسلمان یا ہندو ان سے امن لئے بغیر دہلی یا اس کے اطراف و جوانب میں نہیں آسکتا۔ اور دوسرے بڑے بڑے سردار مثلاً شجاع الملک اور ولایتی بیگم بھی ان عیسائیوں کے حکم اور اجازت کے بغیر علاقہ میں داخل نہیں ہو سکتے "عیسائیوں کا عمل دخل دہلی سے کلکتہ تک پھیلا ہوا ہے"

عام لوگ جو مسلمانوں کی گذشتہ دو سو سال کی سیاسی جدوجہد کی تاریخ سے بے خبر ہیں یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان میں کانگریس ہی سب سے بڑی اور سب سے پہلی وطنی جماعت ہے جو ملک کو اجنبی اقتدار سے آزاد کرنے کے لئے کھڑی ہوئی اس قسم کا خیال قایم کرنا تاریخی اعتبار سے بالکل غلط ہے کیونکہ اول تو کانگرس کی تشکیل ۱۸۵۷ء کے بہت بعد ہوئی اور پھر اس کے اولین مقاصد میں ملک کو آزاد کرنا نہیں بلکہ انگریزوں اور ہندوستانیوں میں باہمی اعتماد پیدا کرنا اور اُن کے دلوں کو ایک کرنا تھا چنانچہ کانگرس کا سب سے پہلا اجلاس جو ۲۸ر دسمبر ۱۸۸۵ء کو مسٹر بنرجی وکیل کلکتہ کی زیر صدارت بمبئی میں منعقد ہوا تھا اور جس میں بمبئی کے مشہور مسلمان تاجر مسٹر رحمت اللہ سیانی اور دوسرے مسلمان بھی شریک ہوئے تھے اس میں انڈین نیشنل کانگرس کے مقاصد حسب ذیل بیان کئے گئے تھے

۱۔ ہندوستان کی آبادی جن مختلف عناصر سے مرکب ہے ان سب کو متحد و متفق کر کے ایک قوم بنانا۔

۲۔ اس طرح جو ہندوستانی قوم پیدا ہو اس کی دماغی۔ اخلاقی اور اجتماعی و سیاسی صلاحیتوں کو بیدار کرنا۔

۳۔ ایسے حالات کی اصلاح و ترمیم کرنا جو ہندوستان کے لئے نقصان کا باعث اور غیر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

منصفانہ ہوں اور اس طرح ہندوستان اور انگلستان میں اتحاد و یگانگت کو استوار کرنا۔

اس واقعہ سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

۱۔ مسلمان اور ہندو اور دوسرے مذاہب کے ارباب نظر نے ۱۸۵۷ء کے بعد ہی یہ محسوس کر لیا تھا کہ انگریز اپنی حکومت کو مضبوط اور دیرپا بنانے کے لئے ہندو اور مسلمانوں کے مذہبی اختلاف سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں ———— جیسا کہ انھوں نے کیا ———— اس بنا پر انھوں نے کانگرس کے قیام کا ایک مقصد یہ بھی قرار دیا تھا کہ ہندوستان کی سب قوموں کو ملا کر ایک ہندوستانی قوم بنایا جائے۔

۲۔ کانگریس کے قیام کا مقصد انگریزوں سے ملک واپس لینا نہیں تھا بلکہ راعی اور رعایا دونوں کے باہمی تعلقات کو خوشگوار رکھنا تھا۔

بہر حال یہ ظاہر ہے کہ کانگرس کے عالم وجود میں آنے سے بہت پہلے۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ صاحب اور آپ کے ہم خیال دوسرے علماء کی رہنمائی میں ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی تھی جو ہندوستان کو انگریزوں کے اقتدار سے نجات دلانا اپنا فرض سمجھتی تھی آگے چل کر ہم بتائیں گے کہ اس جماعت میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی شریک تھے لیکن قیادت اور سیادت بہر حال مسلمانوں کو حاصل تھی۔

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے علاوہ آپ کے شاگرد مولانا عبدالحئی صاحب بھی صراط مستقیم میں لکھتے ہیں "سلطنت شاہجہاں آباد اسم محض بلا حقیقت است کہ اصلاً معنی از سلطنت نماندہ۔

جمہوریت یا فسطائیت علماء کا اصل مقصود نظر

اس موقعہ پر آگے بڑھنے سے قبل یہ معلوم کر لینا موضوع گفتگو کی زیادہ وضاحت کا سبب ہوگا کہ علماء کا سلطنت کے معاملات میں کیا رویہ رہا ہے؟ یعنی یہ کہ انھوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کو جمہوری نظام پر چلانے کی کوشش کی یا وہ اسے فسطائیت کی راہ پر چلانا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چاہتے تھے۔

تاریخ اس کی شاہد ہے کہ علمار نے حکومت کو ہمیشہ جمہوریت کے اصول پر چلنے کی تلقین کی وہ حکومت کو خدا کی مخلوقات جس میں ہر مذہب و ملت کے لوگ شامل ہیں ان کی خدمت کا ذریعہ سمجھتے تھے نہ کہ کسی قسم کے تغلب اور جبر و تشدد کا۔ قرآن کی انسانیت عامہ کی تعلیم کے پیش نظر ان کا اصل مقصد تھا انسانیت کو اس کی نشو و نما میں مدد دینا۔ خدا کی پاک زمین سے ظلم و فساد کی گندگی کو دور کرنا عدل و انصاف کا راج قایم کرنا۔ حق اس کے حقدار کو پہنچانا۔ خدا کے مختلف المذاہب بندوں میں خلوص و محبت اور صلح و آشتی پیدا کرنا۔ حکومت پر ان کا اثر ہوتا تھا اور وہ اس اثر کو اپنے ان مقاصد کے لئے استعمال کرتے تھے جب تک ہندوستان میں سلطنت مغلیہ قایم رہی اور دربار پر علمار کا اثر و اقتدار رہا سلطنت انتظامی معاملات میں اسی عدل و انصاف کے اصول پر عامل رہی اس بنا پر تخت حکومت پر اگرچہ بادشاہ مسلمان نظر آتا تھا لیکن دراصل حکومت کا نظم و نسق جمہوری تھا آج کل جمہوریتوں میں عوام کی رائے الکشن اور انتخابات سے معلوم ہوتی ہے اور اس زمانہ میں جبکہ یہ جدید طریقہ مروج نہیں تھا درباریوں، عمال حکومت، جاسوسوں اور ملک کے عام حالات وغیرہ کے ذریعہ عوام کی رائے اور ان کی خواہشوں کا بادشاہ کو علم حاصل ہوتا رہتا تھا اور وہ ان کی روشنی میں اپنی پالیسی متعین کرتا اور عوام کو مطمئن کرنے کے لئے احکام جاری کرتا تھا چنانچہ انگلستان کے مشہور مقرر اور مدبر برک نے پارلیمنٹ میں ایک مرتبہ تقریر کرتے ہوئے مسلمانوں کے نظام حکومت کے متعلق صاف اور واضح لفظوں میں کہا تھا۔

"عیسائی بادشاہوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے قانون میں بدرجہا زیادہ مضبوطیاں ہیں، ان کا اپنے قانون کی نسبت یہ عقیدہ ہے کہ وہ خدا کی طرف سے ہے اس لئے بادشاہ سے لے کر رعایا تک سب کے سب یکسانیت کے ساتھ قانون اور مذہب کے پابند ہیں ....

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

..... قرآن کے قانون کا ہر ہر حرف ظالموں کے خلاف گرج رہا ہے اس قانون کی شرح کرنے والے علماً یا قاضیوں کا طبقہ موجود ہے جو اس کا محافظ قرار دیا گیا ہے اور جو بادشاہوں کی ناراضی سے محفوظ ہے اور جسے بادشاہ بھی ہاتھ نہیں لگا سکتا ان کے بادشاہوں تک کو حقیقی اعلیٰ طاقت حاصل نہیں ہے بلکہ وہاں کی حکومت ایک حد تک جمہوری ہے "

(تقاریر ایڈمنڈ برک (انگریزی) جلد اول صفحات ۱۰۴ و ۱۰۵)

علماء کے زیر اثر ملکی معاملات میں ہندو یا مسلم کا کوئی امتیاز نہیں تھا دونوں کو یکساں حقوق حاصل تھے اور ان کے ساتھ یکساں معاملہ کیا جاتا تھا چنانچہ ہمارے ملک کے مشہور مصنف پنڈت سندر لال الہ آبادی لکھتے ہیں "

"اکبر - جہانگیر - شاہجہاں اور ان کے بعد اورنگ زیب کے تمام جانشینوں کے زمانہ میں ہندو مسلم یکساں حیثیت رکھتے تھے دونوں مذاہب کی توقیر کی جاتی تھی ہر بادشاہ کی طرف سے بے شمار ہندو مندروں کو جاگیریں اور معافیاں دی گئی تھیں (بحوالہ مسلمانوں کا روشن مستقبل پانچواں ایڈیشن ص ۲۴)

شواہد و نظائر بے شمار ہیں کوئی کہاں تک گنائے صرف ایک واقعہ جو حد درجہ عبرت آموز ہے سن لیجئے - سلطان بن محمد تغلق کا نام کس نے نہ سنا ہوگا تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اس کے جاہ و جلال اور رعب و داب کا کیا عالم تھا - مشہور سیاح ابن بطوطہ اس کے متعلق اپنا چشم دید واقعہ لکھتا ہے -

"ایک مرتبہ سلطان کے خلاف ایک ہندو نے عدالت میں استغاثہ کیا کہ بادشاہ نے اس کے لڑکے کو بے وجہ مارا ہے قاضی نے بادشاہ کو مدعی علیہ کی حیثیت سے عدالت میں طلب کیا اور مقدمہ کی سماعت کی آخر فیصلہ یہ کیا کہ بادشاہ پر جرم ثابت ہے اور اس سے بدلہ لیا جائے سلطان محمد بن تغلق

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے بے چون وچرا عدالت کے فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کردیا۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے "میں نے دیکھا کہ بادشاہ نے عدالت کے فیصلہ کے مطابق ہندو زادہ کو دربار میں بلایا اور اُس کے ہاتھ میں چھڑی دے کر کہا کہ لے مجھ سے اپنا بدلہ لے لے" مزید برآں لڑکے کو اپنے سر کی قسم دے کر کہا کہ جس طرح میں نے تجھ کو مارا ہے تو بھی مجھ کو اسی طرح مار" ابن بطوطہ کا بیان ہے اب لڑکے نے بادشاہ کے اکیس (۲۱) چھڑیاں ماریں یہاں تک کہ ایک مرتبہ تو بادشاہ کی ٹوپی بھی سر پر سے گر پڑی۔

(سفر نامۂ ابن بطوطہ ج ۲ ص ۱۳۰)

دنیا میں عدل وانصاف ہی ایک ایسی چیز ہے جس کے باعث ایک شخص کو کسی حکومت پر مکمل اعتماد ہو سکتا ہے۔ مسلمان بادشاہ چونکہ علماء کی زیر نگرانی اس راہ پر گامزن رہتے تھے۔ اس بناء پر بلا اختلاف مذہب وملت رعایا کو ان پر اعتماد ہوتا تھا اور بغاوت وسرکشی کے واقعات ہوتے بھی تھے تو ان کی بنیاد مذہب کے اختلاف پر نہیں ہوتی تھی۔

علاوہ بریں کسی فرقہ کا اعتماد حاصل کرنے کے لیئے یہ نہایت ضروری ہے کہ اس فرقہ کے لئے بھی حکومت کے عہدوں اور منصبوں کے دروازے ایسے ہی کھلے رکھے جائیں جیسے کہ خود اپنے فرقہ کے لوگوں کے لئے اور ملکی وانتظامی معاملات میں کسی قسم کا کوئی تعصب نہ برتا جائے۔ قرآن کا حکم ہے۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلٰى اَلَّا تَعْدِلُوا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۔

کسی قوم کی طرف سے تکدر تم کو اس پر مجبور نہ کر دے کہ تم انصاف نہ کرو! نہیں! تم بلکہ بہر حال انصاف ہی کرو یہی پرہیزگاری سے زیادہ قریب ہے۔

مغل بادشاہوں نے اس معاملہ میں کہاں تک بے تعصبی برتی تاریخ کے دفتر اُس سے پُر ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اکبر۔ جہانگیر۔ شاہ جہاں ان سے قطع نظر خود اورنگ زیب عالمگیر جو اپنی خشک مذہبیت کے لیے بدنام ہے اس کے عہد حکومت میں راجپوت اور ہندو سینکڑوں کی تعداد میں بڑے بڑے عہدوں اور مناصب پر فائز تھے اور جب کسی نے اس پر اعتراض کیا تو اس نے فوراً کہا وہ دنیوی اور حکومت کے معاملات کا دار و مدار قابلیت اور لیاقت پر ہوتا ہے اس میں مذہب کو دخل ہرگز نہ ہونا چاہیے؟

زوال حکومت کے بعد علما کا نصب العین | یہ جو کچھ آپ نے پڑھا اُس زمانہ سے متعلق ہے جبکہ ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا اقتدار پورے طور پر قایم تھا۔ پھر جب اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد اس میں اضمحلال آنا شروع ہوا اور حالات روز بروز بد سے بدتر ہوتے رہے تو اب علمار نے ان کی اصلاح کی کوشش کی۔ اور اس کوشش سے ان کا مقصد ملک کی خوش حالی۔ امن و امان۔ سکون و اطمینان۔ ظلم و جور کی بیخ کنی اور خلق خدا کی عام رفاہیت و بہبودی تھا ان کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ حکومت مسلمان کی ہو یا غیر مسلم کی وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ جس کی حکومت بھی ہو انصاف کرے اور اس سے خدا کے بندوں کو کوئی دکھ نہ پہنچے پھر خدمت انسانیت کے اس جذبۂ بلند و اعلیٰ کے زیر اثر مقصد کی تکمیل کے لئے وہ سب کچھ کرتے تھے جو ایک باعمل اور سرفروش جماعت کو کرنا چاہیے

چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے فتویٰ کا جو اقتباس اوپر گذر چکا ہے اس میں دو باتیں خاص طور پر لحاظ میں رکھنے کے قابل ہیں۔

۱۔ حضرت شاہ صاحب نے انگریزوں کے خلاف جو ظلم و ستم کی شکایت کی ہے اُس میں مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کا بھی ذکر کیا ہے کہ دونوں شہر دہلی اور اس کے نواح میں امن کا پروانہ حاصل کئے بغیر نہیں آسکتے۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ شاہ صاحب انگریزوں کے مظالم سے صرف مسلمانوں کی نہیں بلکہ ہندوؤں کی بھی گلو خلاصی چاہتے تھے۔

۲۔ شاہ صاحب کسی ملک کے دارالاسلام ہونے کے لئے اس میں محض مسلمانوں کی آبادی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو کافی نہیں سمجھتے بلکہ اس کے لئے وہ یہ بھی ضروری جانتے ہیں کہ مسلمان باعزت طریقہ پر رہیں اور ان کے شعائر مذہبی کا احترام کیا جائے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ اگر کسی ملک میں سیاسی اقتدار اعلیٰ کسی غیر مسلم جماعت کے ہاتھوں میں ہو لیکن مسلمان بھی بہر حال اس اقتدار میں شریک ہوں اور ان کے مذہبی و دینی شعائر کا احترام کیا جاتا ہو تو وہ ملک حضرت شاہ صاحب کے نزدیک بے شبہ دارالاسلام ہوگا اور ازروئے شرع مسلمانوں کا فرض ہوگا کہ وہ اس ملک کو اپنا ملک سمجھ کر اس کے لئے ہر نوع کی خیر خواہی اور خیر اندیشی کا معاملہ کریں۔

علمائے جونپور کا فتوےٰ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے فتوئے کی عبارت سے ہم نے جو دو مذکورۂ بالا نتائج اخذ کئے ہیں اس کی تائید علمائے جونپور کے ایک فتویٰ سے بھی ہوتی ہے مولانا سید طفیل احمد مرحوم ڈاکٹر ہنٹر کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ جب مرہٹوں نے انیسویں صدی کے شروع میں مسلمانوں کی سلطنت کو برباد کیا اور ملک کو تاخت و تاراج کیا اور اس پر قبضہ کرکے رعایا سے چوتھ لینا شروع کیا تو علمائے اسلام سے حسب ذیل استفتا کیا گیا۔

"کیا فرماتے ہیں علمائے دین اور مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ مسلمانوں کا ملک کفار کے ہاتھوں میں چلا گیا ہے جو مسلمانوں کو نماز جمعہ اور عیدین ادا کرنے دیتے ہیں اور شریعت اسلام کو قائم رکھنے کے لئے مسلمانوں کی خواہش کے مطابق قاضی مقرر کرتے ہیں مگر مسلمان حاکم مقرر کرانے کے لئے مسلمانوں کو کفار سے درخواست کرنی پڑتی ہے۔ ایسا ملک "دارالاسلام ہے یا دارالحرب" علمائے جونپور نے اس کے جواب میں فتویٰ دیا کہ ایسا ملک دارالاسلام ہے۔"

(مسلمانان ہند از ڈاکٹر ہنٹر ص ۱۳۶ و ۱۳۵)

حضرت سید احمد شہیدؒ اور انکی تحریک حضرت شاہ ولی اللہ اور پھر حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہما نے اپنے ارشاد و ہدایت سے جس انقلابی پارٹی کی داغ بیل ڈالی تھی۔ آخر کار اس نے انیسویں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صدی عیسوی کے آغاز میں حضرت سید احمد صاحب شہید اور ان کی جماعت حقہ کے روپ میں جنم لیا حضرت سید صاحب اور آپ کے رفقائے کار نے اپنی نواہائے آتشیں سے تمام ملک میں آگ لگا کر ایک ایسی بڑی جمعیت پیدا کر لی جو ملک کو ہر قسم کے شر و فساد اور ظلم و جور سے پاک و صاف کر دے اور مسلمان دوسرے اربابِ مذہب کے ساتھ عزت و خودداری کی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں یہ زمانہ پنجاب میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت کا تھا۔ سید صاحب کو مسلسل اطلاعات پہنچ رہی تھیں کہ مہاراجہ کی حکومت میں مسلمانوں پر ناگفتنی مظالم ہو رہے ہیں ان کے شعائرِ مذہبی کی علانیہ توہین ہو رہی ہے اور عرصۂ حیات ان پر تنگ کر دیا گیا ہے آپ نے اپنے خلیفہ مولانا اسمٰعیل شہید کو ان واقعات کی تحقیق کے لئے پنجاب روانہ کیا اور آخر جب انھوں نے چشم دید حالات دیکھنے کے بعد ان واقعات و مظالم کی تصدیق کر دی تو آپ نے پنجاب کا رخ کر دیا۔

جہاد کا مقصد | لیکن اس جہاد سے سید صاحب کا مقصد ملک گیری یا اور کوئی دنیوی منفعت بالکل نہیں تھا چنانچہ اپنے خطوط میں اور خطبات و مواعظ میں آپ بار بار اس کا تذکرہ فرماتے تھے مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری جو حضرت سید صاحب کے نہایت مستند سوانح نگار ہیں لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک سوال کے جواب میں سید صاحب نے صاف صاف فرمایا کہ "کسی کا ملک چھین کر ہم بادشاہت کرنا نہیں چاہتے بلکہ سکھوں سے جہاد کرنے کی صرف یہی وجہ ہے کہ وہ ہمارے برادرانِ اسلام پر ظلم کرتے اور اذان وغیرہ مذہبی فرائض ادا کرنے میں مزاحم ہوتے ہیں اگر سکھ اب یا ہمارے غلبہ کے بعد ان حرکات مستوجب جہاد سے باز آ جائیں گے تو ہم کو ان سے لڑنے کی ضرورت نہ رہے گی"

(سوانح احمدی ص ۷۰)

ہندوستان کی یہ بہت بڑی بدقسمتی تھی کہ سید صاحب کو مسلمانان پنجاب کی حد درجہ پامالی و زبوں حالی کے باعث مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بالمقابل صف آرا ہونا اور آخر معرکۂ بالاکوٹ میں جام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شہادت نوش کرنا پڑا ورنہ اصل یہ ہے کہ سید صاحب کا حقیقی مقصد ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلط و اقتدار سے نجات دلانا تھا۔ انگریز خود اسے محسوس کرتے تھے اور اس تحریک سے بڑے خوفزدہ تھے اسی بنا پر جب سید صاحب کا ارادہ سکھوں سے جنگ کرنے کا ہوا تو انگریزوں نے اطمینان کا سانس لیا اور جنگی ضرورتوں کے مہیا کرنے میں سید صاحب کی مدد کی۔

سید صاحب کا اصل مقصد چونکہ ہندوستان سے انگریزی تسلط و اقتدار کا قلع قمع کرنا تھا جس کے باعث ہندو اور مسلمان دونوں ہی پریشان تھے اس بنا پر آپ نے اپنے ساتھ ہندوؤں کو بھی شرکت کی دعوت دی اور اُس میں صاف صاف انھیں بتا دیا کہ آپ کا واحد مقصد ملک سے پردیسی لوگوں کا اقتدار ختم کر دینا ہے اس کے بعد حکومت کس کی ہوگی اس سے آپ کو غرض نہیں ہے۔ جو لوگ ملکی حکومت کے اہل ہوں گے۔ ہندو ہوں یا مسلمان یا دونوں وہ حکومت کریں گے چنانچہ اس سلسلہ میں سرحد سے ریاست گوالیار کے مدار المہام اور مہاراج دولت رائے سندھیہ کے وزیر و برادر نسبتی راجہ ہندو رائے کو آپ نے جو خط تحریر فرمایا ہے وہ غور سے پڑھنے کے قابل ہے اس سے آپ کے اصل عزائم اور ملکی حکومت کے متعلق آپ کے نقطۂ نظر پر روشنی پڑتی ہے ہم اس خط کی اہمیت کی وجہ سے اسے بعینہٖ نقل کرتے ہیں[1]۔

بر رائے عالی روشن و مبرہن است کہ	جناب کو خوب معلوم ہے کہ پردیسی سمندر پار کے
بیگانگان بعید الوطن ملوک زمین و زمن	رہنے والے دنیا جہاں کے تاجدار اور یہ سودا بیچنے
گردیدہ و تاجران متاع فروش بپایہ	والے سلطنت کے مالک بن گئے ہیں بڑے بڑے
سلطنت رسیدہ امارت امرائے کبار	امیروں کی امارت اور بڑے بڑے اہل حکومت کی

---

[1] یہ خط اور اس کے بعد والا خط یہ دونوں خطوط مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے حضرت کے قلمی خطوط کے مجموعہ سے اپنی کتاب "مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا" میں از صفحہ ۲۷۲ تا صفحہ ۲۷۳ نقل کئے ہیں۔ ہم نے یہیں سے یہ خطوط مع ترجمہ اخذ کئے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

در ریاست رؤسائے عالی مقدار برباد نمودہ
اند و عزت و اعتبار ایشاں بالکل ربودہ
چوں اہل ریاست و سیاست در زاویہ
خمول نشستہ اند ناچار چندے از اہل فقر
و مسکنت کمر ہمت بستہ ایں جماعت ضعفار
محض بنا بر خدمت دین رب العالمین
برخاستند ہرگز ہرگز از دنیا داران جاہ طلب
نیستند محض بنا بر خدمت دین رب ذوالجلال
برخاستہ اند نہ بنا بر طمع مال و منال رفتہ رفتہ
کہ میدان ہندوستاں از بیگانگاں و دشمناں
خالی گردیدہ و نیز سعی ایشاں برہدف
مراد رسیدہ آئندہ مناصب ریاست
و سیاست بطالبین آں مسلم باد دریغ
شوکت و سطوت ایشاں محکم شود و ایں
ضعفائے را آرزو رؤسائے کبار و عظمائے
عالی مقدار ہمیں قدر مطلوب است کہ خدمت
اسلام بجان و دل کنند و بر مسند مملکت
متمکن شوند

کی حکومت اور ان کی عزت و حرمت کو انھوں نے
خاک میں ملا دیا ہے، جو حکومت و سیاست کے
مرد میدان تھے وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں
اس لئے مجبوراً چند غریب و بے سر و سامان کمر ہمت
باندھ کر کھڑے ہو گئے اور محض اللہ کے دین کی خدمت
کے لئے اپنے گھروں سے نکل آئے یہ اللہ کے بندے
ہرگز دنیادار اور جاہ طلب نہیں ہیں محض اللہ کے
دین کی خدمت کے لئے اٹھے ہیں مال و دولت کی
ان کو ذرہ برابر طمع نہیں جس وقت ہندوستان ان
غیر ملکی دشمنوں سے خالی ہو جائے گا اور ہماری
کوششیں بار آور ہوں گی حکومت کے عہدے اور
منصب ان لوگوں کو ملیں گے جن کو ان کی طلب
ہو گی اور ان (ملکی) حکام و اہل ریاست کی حکومت
و قوت کی بنیاد مستحکم ہو گی ہم کمزوروں کو والیانِ
ریاست اور بڑے بڑے سرداروں سے صرف اسی
بات کی خواہش ہے کہ جان و دل سے اسلام کی
خدمت کریں اور اپنے مسند حکومت پر برقرار
رہیں۔

ریاست گوالیار کے ایک مسلمان عہدہ دار غلام حیدر خاں کو تحریر فرماتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دریں صورت مناسب وقت چناں می نماید
کہ ریاست پیرائے، سیاست آرائے
عظمت نشاں راجہ ہندوے را ایں معنیٰ
بفہمانند کہ اکثر بلاد ہندوستان بدست
بیگانگان افتادہ والیشاں ہر جا بنیاد
آئین ظلم و جور نہادہ ریاست روٴسائے
ہندوستان برباد رفتہ کسے تاب مقاومت
ایشاں نمی دارد بلکہ ہر کس ایشاں را
آقائے خود می شمارد و چوں روٴسائے
کبار از مقابلۂ ایشاں نشستند لاچار
چند کس از ضعفائے بے مقدار کمر بستند
پس دریں صورت روٴسائے عالی مقدار
را لازم چنانچہ بر مسند ریاست سالہا
سال متمکن ماندہ اند بالفعل در اعانت
ضعفائے مذکورین مساعی بلیغہ بجا آرند
و آں را باعث استحکام بنیان ریاست
خود شمارند (مجموعہ خطوط قلمی ص ۱۴۱)

ایسی صورت میں مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ
آپ سردار والا قدر راجہ ہندو رائے کے یہ مضمون
ذہن نشین کریں کہ ملک ہندوستان کا بڑا حصہ
غیر ملکیوں کے قبضہ میں چلا گیا اور انھوں نے ہر جگہ
ظلم و زیادتی پر کمر باندھی ہے ہندوستان کے
حاکموں کی حکومت برباد ہو گئی کسی کو ان کے مقابلہ
کی تاب نہیں بلکہ ہر ایک ان کو اپنا آقا سمجھنے لگا
ہے چونکہ بڑے بڑے اہل حکومت ان کا مقابلہ کرنے
کا خیال ترک کر کے بیٹھ گئے ہیں اس لیے چند کمزور
و بے حقیقت اشخاص نے اس کام کا بیڑا اٹھایا
اس صورت میں ان بڑے سرداروں کے لئے مناسب
یہی ہے جو سالہا سال سے اپنی مسند ریاست
پر متمکن چلے آ رہے ہیں کہ اب ان کمزوروں کی ہر
طرح امداد کریں اور اس بات کو اپنی حکومت
کے استحکام کا باعث سمجھیں۔

حضرت سید صاحب کے ان خطوط کو غور سے پڑھنے کے بعد تجزیہ کیجئے تو حسب ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۔ آپ انگریزوں کو "بیگانگانِ بعید الوطن" اور پردیسی سمجھتے تھے اور ان کے استیلاد تغلب سے تنگ آکر ان سے لڑنے کا عزم رکھتے تھے۔

۲۔ آپ ہندوستان کو اپنا ملک اور وطن سمجھتے تھے۔

۳۔ جہاد سے آپ کا مقصد خود اپنی حکومت، قایم کرنا ہرگز نہیں تھا بلکہ دینِ رب العلمین کی خدمت تھا۔

۴۔ ہندوؤں سے اختلافِ مذہب کی بنا پر آپ کو پرخاش تو کیا ہوتی آپ کمپنی کے ہاتھوں مظلومیت و پامالی میں ہندو اور مسلمان دونوں کو یکساں شریک مانتے تھے اور جہاد سے آپ کی غرض دونوں کو ہی اجنبی اقتدار کی نحوست سے نجات دلانا تھا۔

۵۔ کامیاب ہونے کے بعد ہندوستان میں ملکی حکومت کا نقشہ کیا ہوگا؟ اس کا فیصلہ آپ طالبینِ مناصب ریاست و سیاست پر چھوڑتے ہیں۔ مگر ہندوؤں کو یہ اطمینان ضرور دلاتے ہیں کہ وہ سید صاحب کی کوششوں کو اپنی ریاست کی بنیاد کے مستحکم ہونے کا باعث سمجھیں اور اور پھر سید صاحب کا ہندو ریاستوں کو مدد اور شرکت جنگ کی دعوت دینا اور اپنے توپخانہ کا افسر راجہ رام راجپوت کو مقرر کرنا یہ خود اس کی دلیل ہے کہ آپ ہندوؤں کو اپنا محکوم نہیں بلکہ شریکِ حکومت بنانا چاہتے تھے بیشک سید صاحب جگہ جگہ اعلاء کلمۃ اللہ اور دین رب العلمین کی خدمت کا ذکر کرتے اور اسی کو اپنی مساعی کا محرک بتاتے ہیں لیکن آپ یہ خوب سمجھتے تھے کہ اعلاء کلمۃ اللہ کا ذریعہ صرف یہی نہیں ہے کہ ایک فرقہ وار گورنمنٹ قایم کی جائے اور خود حاکم بن کر دوسرے برادرانِ وطن کو اپنا محکوم بنایا جائے بلکہ اس کا سب سے زیادہ موثر طریقہ یہ ہے کہ برادرانِ وطن کو سیاسی اقتدار میں اپنا شریک کرکے اسلامی فضائلِ اخلاق سے ان کے دلوں کو فتح کیا جائے۔ اقلیت اور اکثریت کے مسئلہ کی کوئی پیچیدگی آپ کے ذہن میں نہیں تھی۔ کیونکہ آپ کے نزدیک یہ دونوں بے حقیقت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چیزیں تھیں جو اپنے عمل میں سب سے زیادہ پُرجوش۔ فداکار۔ سرگرم اور مخلص و دیانت دار ہوگا امامت اور لیڈرشپ اسی کے ہاتھ میں رہیگی خواہ اقلیت کے فرقے سے تعلق رکھے یا اکثریت کے فرقہ سے۔ قرآن مجید کی آیت

كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً   کتنی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں ہیں جو بڑی ٹکڑیوں پر غالب آجاتی ہیں۔

آپ کے لئے مشعلِ راہ تھی۔ اقلیت میں ہونے کا خوف وہراس اور دسوسہ و اندیشہ صرف اسی شخص یا گروہ کو ہوسکتا ہے جو سست عمل۔ کمزور اور سبک مایہ ہو۔ اور جو اپنے بچاؤ کے لئے خارجی قلعہ بندیوں کا محتاج ہو۔

ہندوستان کی سرزمین کو اپنی سخت جانی کا امتحان ابھی ایک سو برس سے زائد مدت تک اور دینا تھا کہ حضرت سید صاحب ۱۸۳۱ء کے مئی کے مہینہ میں بمقام بالاکوٹ اپنے محبوب ترین رفقا کے ساتھ شہید ہوگئے اور اس جماعت کا شیرازہ بکھر گیا۔

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی

ہر چند کہ آپ دنیا میں نہ رہے لیکن اپنے نفسِ شرربار سے یہاں کے اربابِ عزیمت اور سرفروشانِ حق و صداقت کے دلوں میں ظلم و فساد کے استیصال اور استخلاصِ وطن و احیائے ملت اسلامیہ کے جذبہ کی جو آگ روشن کر گئے تھے وہ یوں سرد ہونے والی نہیں تھی آپ کی جماعت کے بہت سے افراد "مجاہدین" کے نام سے سرحد کے مختلف علاقوں میں پھیل گئے ۱۸۶۴ء تک اس جماعت کی نمایاں سرگرمیاں جاری رہیں۔ ان کے علاوہ جو اربابِ عزیمت ہندوستان کے اندر موجود تھے انھوں نے ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی کا نقارہ بجایا۔ یہ حقیقت ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ اس جنگ کی قیادت اور رہنمائی کا شرف بھی انھیں حضرات کو حاصل تھا جو حضرت سید صاحب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے بواسطۂ علمی اور دینی رابطہ رکھتے تھے اور جو حضرت ہی کی طرح اربابِ علم ودین اور اصحاب شریعت وطریقت تھے۔ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب، حافظ سید ضامن شہید صاحب اور دوسری جانب مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی، مفتی عنایت احمد صاحب کاکوروی اور دوسرے اعاظمِ علماء واکابرِ ملت اس جنگ میں شریک تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ جنگ ناکام ہوگئی تو حضرت حاجی صاحب ہجرت کر گئے۔ حافظ ضامن علیہ صاحب لڑتے ہی لڑتے شہادت کی سعادت سے سرفراز ہوگئے تھے اور دو موخر الذکر حضرات کو کالے پانی کی سزا کا حکم ہوا۔

اگرچہ اس جنگ کی تحریک اور اس میں سب سے بڑا دخل علمائے کرام کو تھا اور لڑنے والوں میں مسلمانوں کی ہی تعداد زیادہ تھی جیسا کہ مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی نے الثورۃ الہندیہ میں تصریح کی ہے اور اسی بنا پر جب انگریزوں کی حکومت یہاں قائم ہوگئی تو انھوں نے اس "غدر" کا انتقام سب سے زیادہ مسلمانوں سے ہی لیا اور اُن کو ہی بُری طرح پامال کیا گیا لیکن انگریزوں کے خلاف یہ جنگ بلاشبہ ایک قومی جنگ تھی ہندو اور مسلمان دونوں ہی ان سے لڑ رہے تھے اس سلسلہ میں جہاں مسلمان علماء امرا اور ارباب دولت کے نام نظر آتے ہیں ہندوؤں میں مہاراجہ بھور عرف ناناصاحب اور رانی جھانسی وغیرہ کے نام بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔ ملک اور وطن کے غدار تھے تو حکیم احسن اللہ خاں اور بلدیو سنگھ راجہ پٹیالہ کی طرح ہندو اور مسلمان دونوں ہی تھے اور ملک کے سرفروش وجانباز سپاہی تھے تو ہندو اور مسلمان دونوں ہی تھے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بہرحال تحریکِ آزادی کی طرح اس جنگ آزادی کی قیادت اور لیڈرشپ بھی مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی اور اس میں ہندو اور مسلمان کی کوئی تفریق نہیں تھی بلکہ ہندوستان اور ہندوستانیوں کی جنگ انگریزوں اور پردیسی سوداگروں سے تھی جو باہر سے آکر اس ملک پر قبضہ کر بیٹھے تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سرسید اور علماء

جنگ پلاسی (۱۷۵۷ء) اور جنگ میسور (۱۷۹۹ء) کی طرح ۱۸۵۷ء کی یہ جنگ آزادی بھی ناکام رہی اس کی پاداش میں مسلمانوں کو بہت زیادہ اور ہندوؤں کو نسبتہً کم جو مصائب و آلام برداشت کرنا پڑے وہ تاریخ کی کوئی پوشیدہ حقیقت نہیں ہے۔ یہ جنگ کیوں ناکام ہوئی؟ اس کے اسباب و وجوہ پر بحث کرنا ہمارے موضوعِ گفتگو سے خارج ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کے بعد علماء کا اور بعض اور جماعتوں کا کیا رویہ رہا؟

ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت کے قائم ہو جانے کے بعد مسلمانوں کی قیادت دو مختلف شاخوں میں بٹ گئی۔ ایک جانب سرسید اور ان کا گروپ تھا جنہوں نے ازراہِ خیر سگالی محسوس کیا کہ مسلمانوں کے لئے اب اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہیں ہے کہ اُن کو یہاں کے بدیسی حاکموں سے قریب تر کیا جائے اور اُن میں اور انگریزوں میں جو شدید قسم کی اجنبیت پائی جاتی ہے اس کو دور کر کے اعتمادِ باہمی پیدا کیا جائے سرسید نے دیکھا کہ ہندوؤں نے انگریزوں کی حکومت سے تعاون شروع کر دیا ہے۔ اس بناء پر اُن کو خیال ہوا کہ اب اگر مسلمان حکومت سے تعاون نہیں کرتے تو لازمی طور پر وہ اپنے برادرانِ وطن سے بہت پیچھے رہ جائیں گے حکومت میں اُن کو کوئی عمل دخل نہ ہوگا اور ان کی حیثیت ہندوستان میں راجپوتوں جیسی ہو جائے گی۔ اس خیال کے ماتحت انھوں نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ کیا۔ عام مسلمان انگریزوں کے ساتھ اپنے پرانے جذبۂ نفرت کے باعث جس کی بنیاد انگریزوں کی اقتصادی لوٹ کھسوٹ اور اُن کے مظالم پر تھی سرسید کی بات سننے کے لئے آمادہ نہ تھے اور وہ انگریزوں کی طرح خود سرسید کو بھی شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنے لگ گئے تھے۔ لیکن سرسید اپنے جذبۂ بے قرار سے مجبور تھے۔ انھوں نے اپنے خیالات کی اشاعت اور مسلمانوں میں ذہنی انقلاب پیدا کرنے کی غرض سے ملک کے گوشہ گوشہ کی خاک چھانی ہر اربابِ ملت کے سامنے روئے گڑگڑائے اُن کے قدموں پر اپنی ٹوپی رکھی اور ان کو آمادہ کیا کہ وہ ماضی کی پرانی داستانوں کو بھول کر وقت کے نئے مطالبہ کو سنیں اور اپنے مستقبل کو بہتر بنانے کی مساعی میں ہمہ تن لگ جائیں

مسلمانوں میں انگریزی تعلیم

سرسید نے اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے علیگڑھ میں انگریزی زبان اور اس کے علوم و فنون کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تعلیم کا ایک مدرسۃ العلوم قایم کیا اور دوسری جانب تہذیب الاخلاق جاری کیا جس میں اسلام اور اس کی تعلیمات پر پے در پے مضامین لکھے مسلمانوں کی موجودہ ضرورتوں پر نیم سیاسی اور نیم مذہبی و اخلاقی مقالات تحریر کئے ان کا مقصد جہاں ایک طرف مسلمانوں میں وقت شناسی۔ مصلحت کوشی اور دماغ کی بیداری کا پیدا کرنا تھا۔ دوسری جانب ان سے غرض یہ بھی تھی کہ انگریزوں کو بعض اسلامی تعلیمات کی وجہ سے مسلمانوں کی نسبت جو شکوک و شبہات تھے اُن کو دور کیا جائے۔ اس سلسلہ میں وہ اتنے آگے بڑھ گئے کہ انھیں اسلامی حدبندیوں کا بھی خیال نہیں رہا اور اس بنا پر انھوں نے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائیں۔

یہاں سرسید کے مذہبی افکار و عقائد سے بحث مقصود نہیں بلکہ مسلمانوں کی سیاسی فلاح و بہبود کے لئے انھوں نے جو کام کیا صرف اس کا ایک سرسری جائزہ لینا ہے۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سرسید کا انگریزی تعلیم اور انگریزی علوم و فنون کی طرف مسلمانوں کو متوجہ کرنا وقت کا ایک بہت بڑا تقاضا تھا جو انھوں نے محسوس کیا اور اس کے لئے انھوں نے شب و روز کی محنت و مشقت کرکے اور قوم کی گالیاں سننے کے باوجود جد و جہد کی وہ بے شبہ اُن کی قومی غمگساری اور دردمندی کی دلیل ہے ورنہ اگر سرسید کو اپنی کوششوں میں کامیابی نہ ہوتی اور مغربی علوم و فنون کی طرف سے ان کی نفرت کا وہی عالم رہتا جو اس وقت تھا تو کوئی کیا بتا سکتا ہے کہ ان کی پسماندگی نے آج انھیں کہاں پہنچا دیا ہوتا نہ کسی ایک محکمہ میں نہ کسی دفتر میں کسی عہدہ اور منصب پر کوئی مسلمان نظر آتا اور نہ اُن کو دنیا کی جدید ترقیات اور جدید افکار و آرار کا کوئی علم ہوتا۔ نہ اُن کی کوئی بات سُنتا اور نہ وہ اپنی آواز کسی کو سنا سکتے تھے

لیکن سرسید اور اُن کے رفقار کی ان کوششوں اور اُن کی ان خدماتِ قومی کے اعتراف کے باوجود نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ انھوں نے انگریزی تعلیم کی اشاعت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں جو فکر پیدا کیا وہ ان کے حق میں آئندہ چل کر ایک زہر ثابت ہوا۔ اور اس فکر کی وجہ سے مسلمان اپنی اُن تہذیبی اور تمدنی روایات سے دور جا پڑے جن کے باعث ہندوستان میں ان کو ایک امتیاز حاصل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھا اس فکر کا تجزیہ کیا جائے تو دو باتیں خاص نمایاں نظر آئیں گی ایک انگریزی حکومت سے انتہائی مرعوبیت اور دوسرے مسلمانوں میں ہندوؤں سے علیحدگی کا جذبہ۔

سرسید کی انگریزوں سے مرعوبیت

جہانتک پہلی چیز کا تعلق ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سرسید نے صرف انگریزی علوم و فنون کی اشاعت نہیں کی بلکہ مسلمانوں کو انگریزی تہذیب و تمدن اور انگریزی معاشرت اختیار کر لینے کی بھی تلقین کی گویا ان کے نزدیک کسی چیز کے اچھا یا برا ہونے کا معیار یہ تھا کہ انگریز ایسا کرتے ہیں یا نہیں کرتے ان کے خطبات دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ کس طرح طلبائے مدرسۃ العلوم سے بار بار اور بتاکید کہتے تھے کہ وہ انگریزوں کی طرح کھانا پینا اور ان کی طرح اٹھنا بیٹھنا بھی سیکھیں کھانے کے وقت چھری اور کانٹے کے صحیح استعمال کی مشق بہم پہونچائیں علاوہ بریں انھوں نے انگریزی تعلیم اور انگریزی علوم و فنون اور انگریزی تہذیب و تمدن پر اتنا زور دیا کہ ان کے سوا ہر چیز نظر انداز ہی کر دی مذہبی فکر میں اعتزال پیدا کیا دین کے بنیادی عقاید کو مضحمل اور کمزور بنایا اسلامی علوم و فنون کی مخالفت کی اور عربی زبان اور عربی نظم و نثر کا مذاق اڑایا ان مسائل پر کبھی خود اپنے نام سے اور کبھی ریڈیکل کے فرضی نام سے پر زور مقالات لکھے جن کے جواب میں مولانا شبلی نے نہایت مدلل اور مسکت مقالات تحریر کئے ان سب چیزوں کا اثر یہ ہوا کہ علیگڈھ مذہب سے بے اعتنائی اور مغرب زدگی میں مشہور ہو گیا اور ایک بڑا طبقہ جو علماء کے فتوے کے بغیر لقمہ نہیں توڑتا تھا وہ نہ صرف یہ کہ علماء سے منحرف بن گیا بلکہ احکام و مسائل دینی کی کھلم کھلا تضحیک و تذلیل کرنے لگا اور مغربی معاشرت کو اس نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ اسی طرح سرسید نے سیاسی غلامی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو ذہنی اور دماغی اور اخلاقی اعتبار سے بھی انگریزوں کا غلام بنا دیا۔ انھیں اب اسلامی تعلیمات۔ اسلامی معاشرت اور اسلامی تصور زندگی کے ساتھ اپنی ہندوستانیت سے بھی نفرت ہو گئی اردو میں بولنا ان کے لئے ننگ تھا اور انگریزی میں گفتگو کرنا سرمایۂ فخر و نازش ہندوستان کا قومی لباس پہنتے ہوئے انھیں شرم آتی تھی اور انگریزی لباس زیب تن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کر کے ان کی گردن اکڑ جاتی تھی اسی طرح انگریزی تعلیم کی اشاعت سے لارڈ مکالے کے قول کے مطابق انگریزوں کا جو اصل مقصد تھا یعنی ایک ایسی درمیانی مخلوق پیدا کرنا جو صورت، شکل اور رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہو مگر ذہن اور دماغ کے لحاظ سے انگریز ہو۔ وہ سرسید کی کوششوں سے پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔

سرسید اور متحدہ قومیت | اب رہی دوسری چیز یعنی یہ کہ سرسید کی تحریک کا ہندو مسلمانوں کے باہمی تعلقات پر کیا اثر پڑا؟ تو اس سلسلہ میں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ شروع شروع میں سرسید بھی علماء کی طرح ہندو اور مسلمان۔ سکھ اور عیسائی جو اس ملک کے باشندے تھے ان سب کو بحیثیت ہندوستانی ہونے کے ایک قوم مانتے تھے اور شہری حقوق میں ان کی برابری کے قائل تھے چنانچہ ایک لکچر میں فرماتے ہیں

قوم کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے ....

.... یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے۔ ورنہ ہندو مسلمان اور عیسائی بھی جو اس ملک کے رہنے والے ہیں اس اعتبار سے سب ایک قوم ہیں جب یہ سب گروہ ایک قوم کہے جاتے ہیں تو ان سب کو ملکی فائدہ میں جو ان سب کا ملک کہلاتا ہے ایک ہونا چاہئے اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ صرف مذہب کے خیال سے ایک ملک کے باشندے دو قومیں سمجھے جائیں[1]

ایک اور موقع پر تو انھوں نے جرأت سے کام لیکر یہاں تک کہہ دیا۔

"جس طرح آریہ قوم کے لوگ ہندو کہلائے جاتے ہیں اسی طرح مسلمان بھی ہندو یعنی ہندوستان کے رہنے والے کہلائے جاتے ہیں"[2]

ایک مرتبہ سفر پنجاب میں ہندوؤں کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا۔

"آپ نے اپنے لئے جو لفظ ہندو کا استعمال کیا ہے وہ میری رائے میں درست نہیں ہے کیونکہ

---

[1] مجموعۂ لکچر سرسید ص ۱۶۷ [2] سرسید کے آخری مضامین ص ۵۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہندو میری رائے میں کسی مذہب کا نام نہیں ہے بلکہ ہر ایک شخص ہندوستان کا رہنے والا اپنے تئیں ہندو کہہ سکتا ہے پس مجھے نہایت افسوس ہے کہ آپ مجھ کو باوجود اس کے کہ میں ہندوستان کا رہنے والا ہوں ہندو نہیں سمجھتے۔" (سفرنامہ پنجاب سرسید ص ۱۳۹)

سرسید اور ہندو مسلم اتحاد

ان خیالات کی وجہ سے وہ ہندو مسلم اتحاد کے اس وقت تک بڑے زبردست حامی تھے اور جگہ جگہ اس کی تبلیغ کرتے پھرتے تھے۔ چنانچہ ایک موقع پر انھوں نے نہایت زوردار الفاظ میں فرمایا

"ہم نے متعدد مرتبہ کہا ہے کہ ہندو مسلمان اس کی دو آنکھیں ہیں، اس کی خوبصورتی اس میں ہے کہ اس کی دونوں آنکھیں سلامت اور برابر ہیں اگر ان میں سے ایک برابر نہ رہی تو وہ خوبصورت دلہن بھینگی ہو جائے گی، اور اگر ایک آنکھ جاتی رہی تو کانی ہو جائے گی۔"[1]

متحدہ قومیت کے قائل ہونے اور ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی ہونے کی بنا پر برادرانِ وطن ان کو نہ صرف یہ کہ اعتماد اور بھروسہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے بلکہ ان کو اپنا بھی لیڈر سمجھنے لگے تھے وہ جہاں کہیں جاتے تھے ہندو بھی اُن کو خوش آمدید کہنے، انھیں سپاسنامہ پیش کرنے اور ہر طرح ان کی آؤ بھگت کرتے تھے مدرسۃ العلوم علیگڈھ کے چندہ میں شریک ہوتے تھے۔ علاوہ بریں بعض ہندو راجاؤں اور مہاراجوں کے مقابلہ میں جنھوں نے ملک کے مفاد کا ساتھ نہیں دیا تھا سرسید کو اپنا خیرخواہ اور سچا محب وطن لیڈر تسلیم کرتے تھے چنانچہ سفر پنجاب کے سلسلہ میں وہ جالندھر پہنچے تو انھیں برہمو سماج اور آریہ سماج کے ایک وفد نے بھی سپاسنامہ پیش کیا اور اس میں علانیہ اس کا اعتراف کیا کہ "ہندو راجہ مہاراجہ جن سے بہت کچھ امید کی جا سکتی تھی ملک کے خیرخواہ ثابت نہیں ہوئے۔ لیکن آپ نے حب الوطنی کو ہاتھ سے نہیں دیا اور البرٹ بل اور دیگر ملکی تجویزوں کی کونسل میں استقلال کے ساتھ حمایت کی"[2] (مقالات سرسید مطبوعہ کشمیری پریس لاہور ص ۵) اور یہ واقعہ ہے کہ اس وقت تک سرسید ایک سچے محب وطن کی حیثیت

---

[1] سرسید کے آخری مضامین ص ۵۵ [2] یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ہندو مسلم تعلقات کے سلسلہ میں سرسید کی تقریروں

بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے ملکی معاملات میں فرقہ وارانہ نقطۂ نظر کو پاس نہیں آنے دیتے تھے یہاں تک کہ وہ کونسل کی نشستوں، سرکاری عہدوں اور دوسرے حقوق کا مطالبہ کرتے وقت مسلمانوں یا ہندوؤں کے لفظ کے بجائے "ہندوستانیوں" کا لفظ استعمال کرتے تھے اور کونسل میں نمائندگی کے لئے مخلوط انتخاب پر زور دیتے تھے

⁂ ⁂ ⁂

سیاسی نقطۂ نظر میں تبدیلی لیکن افسوس ہے کہ سرسید کا یہ رنگ مستقل اور دیرپا ثابت نہیں ہوا اور انگریزوں کی سیاست کے زیراثر ان کے سیاسی مسلک میں اچانک تبدیلی پیدا ہوگئی انگریز اپنی حکومت کے بقا اور استمرار کے لئے دو چیزیں نہایت ضروری سمجھتے تھے ایک یہ کہ مسلمان پکے اور سچے مسلمان نہ رہیں اور دوسرے یہ کہ ہندوستانی قومیت متحدہ کا تصور ان کے دماغ سے فنا ہو جائے۔ ان دو مقصدوں کے لئے انھوں نے مدرسۃ العلوم علیگڈھ کے انگریز پرنسپل مسٹر بیک کو سرسید اور ان کی جماعت پر حاوی کر دیا اور بالآخر وہ اپنے مقصد کے حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ حیرت ہوتی ہے کہ "اسباب بغاوت ہند" کا مصنف قومیت متحدہ کا داعی۔ ہندو مسلم اتحاد کا منادی۔ اور ہندوستانی قومیت پر فخر کرنے والا سرسید کس طرح یک بیک ایک طرف تو انگریزوں کا ایسا زبردست حامی اور ہمدرد بن جاتا ہے کہ انگریزوں کی حمایت میں ترکوں کی مخالفت کرتا ہے خلافت اسلامیہ سے مسلمانان ہند کو بے تعلق کرنے کی غرض سے مقالات تحریر کرتا ہے۔ مصر کے نوجوانوں میں انگریزوں کا پروپیگنڈہ کرنے کے لئے اپنے آدمی بھیجتا ہے اور انگریزوں کو اولی الامر قرار دے کر ان کی اطاعت و فرمانبرداری کو مسلمانوں کے لئے فریضۂ مذہبی بتاتا ہے اور ہر امر میں ان کی نقالی اور تقلید کو مسلمانوں کی نجات کا واحد ذریعہ سمجھتا ہے اور دوسری جانب ہندو اور مسلمان دونوں کو دو الگ الگ قومیں قرار دے کر ان کے باہمی اتحاد و اتفاق کے امکان سے انکار کرتا ہے۔ اس کے نزدیک انگریزوں اور مسلمانوں میں دوستی ممکن ہے لیکن یہ ناممکن ہے کہ ہندو اور مسلمان

حاشیہ صفحہ گذشتہ یا مقالات کے جو اقتباسات سطور بالا میں پیش کئے گئے ہیں وہ سب مولانا سید طفیل احمد صاحب مرحوم کی فاضلانہ کتاب "مسلمانوں کا روشن مستقبل" سے ماخوذ ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دونوں مل کر جمہوری طرز کی کوئی حکومت بنائیں۔

یہ انقلاب ذہنیت مسٹر بیک کی مسلسل کوششوں کا نتیجہ تھا چنانچہ مولانا سید طفیل احمد صاحب لکھتے ہیں۔

"مسٹر بیک کی حکمت عملی نے صرف پندرہ سال کے عرصہ میں نہ صرف علیگڈھ کے طلبار کی بلکہ علیگڈھ تحریک کے کل حامیوں کی ذہنیت کو بالکل بدل دیا اور خداوند تعالیٰ سے کہیں زیادہ ان پر حکام کی بلکہ اس سے زیادہ ہندو اکثریت کی ہیبت طاری ہوگئی اور وہ سمجھنے لگے کہ اگر حکومت کمزور ہوگئی تو برادرانِ وطن سات کروڑ مسلمانوں کو ہڑپ کر جائیں گے" (مسلمانوں کا روشن مستقبل پانچواں ایڈیشن ص ۳۲۶)

بس یہ دن ہے کہ علیگڈھ کے سیاسی نقطۂ نظر میں فرقہ وارانہ رنگ پیدا ہوا ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قوم قرار دیا گیا مسلمانوں کے دلوں میں ہندو اکثریت کی طرف سے بے اعتمادی پیدا کی گئی اور ان سے ڈر زدہ کرکے مسلمانوں میں یہ جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی کہ وہ انگریزوں کی حکومت کو زیادہ سے زیادہ مضبوط اور مستحکم کرنے کی سعی کریں اور ملکی معاملات میں برادرانِ وطن کے ساتھ اشتراک و تعاون سے باز رہیں

یہ جو کچھ آپ نے پڑھا علیگڑھ کی تحریک کی مختصر روداد تھی اب دیکھئے کہ اس کے بالمقابل ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد علمار کا رویہ اور ان کا سیاسی نقطۂ نظر کیا رہا اور اس سلسلہ میں انہوں نے کیا کچھ کیا ؟

(باقی آئندہ)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اجماع اور اُس کی حقیقت

از جناب محمد ہاشم صاحب ایم - اے

(۲)

خلاصہ یہ ہے کہ اجماع کی راہ سے دین میں کسی مسئلہ کا اضافہ نہیں ہوتا بلکہ مسئلہ کا تعلق تو تمام اس یا سنت بلکہ کتاب ہی سے ہوتا ہے صرف علمی تعلق مسئلہ سے اگر پہلے ظنی تھا تو اجماع اسی کیفیت کو قطعیت سے بدل دیتا ہے اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اجماعی مسائل میں دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک تو وہ دلیل جس سے اصل مسئلہ ثابت ہو اور اس کے بعد اس ثابت شدہ مسئلے پر اجماع، رہ گئی یہ بات کہ ہر وہ مسئلہ جس پر اجماع قایم ہوا ہے کیا اس کی دلیل کا جاننا بھی ضروری ہے ایک سوال ہے میں نے جیسا کہ کہا دلیل کا ہونا تو ضروری ہے لیکن دلیل کا علم اور جاننا یہ بھی ضروری ہے یا نہیں اس باب میں علماء کی رائیں مختلف ہیں، عام خیال یہی معلوم ہوتا ہے کہ دلیل ہونا تو ضروری ہے لیکن اس کا جاننا ضروری نہیں ہے۔ اور یہی مطلب ہے صاحب کشف کے ان الفاظ کا

الاجماع لا ینعقد الا من العلماء	اجماع جب ہوا کرتا ہے تو وہ اہل علم ہی کا تو
اهل الديانة ولا يتصور منهم الاجماع	اجماع ہوتا ہے ان ہی لوگوں کا جو صاحب
على حكم من احكام الله تعالى جزافاً	دیانت و تقویٰ ہوتے ہیں اب ظاہر ہے کہ
بل بناء على حديث سمعوه او	علم و دین والوں سے یہ بات ناقابل تصور ہے
معنى المنصوص ورده موترا في الحكم منه	کہ الل ٹپ بغیر کسی دلیل کے اللہ کے احکام

© rasailojaraid.com